



مقالات

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ — توضیحی مطالعہ

تقسیم وراثت

بہن بھائیوں کا حصہ

”إِخْوَةٌ“ کا لفظ اس آیت میں، ہمارے نزدیک محض وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔... مرنے والا اپنے پیچھے ایک بھائی یا بہن چھوڑ کر بھی رخصت ہو سکتا ہے اور اُس کے بہن بھائی پانچ دس بھی ہو سکتے ہیں۔ ”إِخْوَةٌ“ کا لفظ ان سب صورتوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔“

(میزان ۵۲۳-۵۲۴)

”... فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ“ کے بعد بھی ہمارے نزدیک ”وَلِأَبِيهِ“ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس کا قرینہ بھی بالکل واضح ہے۔ بھائی بہن موجود ہوں تو ماں کا حصہ وہی ہے جو اوپر اولاد کی موجودگی میں بیان ہوا ہے۔ یہ مذکور اس بات پر خود دلیل ہے کہ باپ کا حصہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔... اس حکم سے واضح ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ

نے بہن بھائیوں کو ان کا قائم مقام ٹھہرایا ہے۔“ (میزان ۵۲۳)

”... اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے وارث اُس کے بھائی بہن ہیں، لیکن اسلوب بیان کی یہ دلالت، ظاہر ہے کہ دلالت الفاظ کی طرح ہر احتمال سے خالی نہیں ہے کہ اس مسئلے پر بحث کی گنجائش باقی نہ رہے۔“ (میزان ۵۳۱)

سورۃ نساء میں احکام وراثت کے بیان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر مرنے والے کے اولاد ہو تو اس کے ماں باپ، دونوں کو ترکے میں سے چھٹا، چھٹا حصہ ملے گا، لیکن اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملے گا، (جب کہ باقی دو تہائی باپ کو مل جائے گا)۔ البتہ اگر مرنے والے کے ’اخوۃ‘ ہوں تو ماں کا حصہ پھر کم ہو کر دوبارہ چھٹا حصہ رہ جائے گا۔

یہاں دو اہم تفسیری و فقہی سوالات تنقیح کے متقاضی ہیں:

پہلا یہ کہ جمہور اہل علم کے نزدیک یہاں ’اخوۃ‘ کسے خاص طور پر صرف بھائی مراد ہیں، یعنی صرف بہنوں کی موجودگی میں اس حکم کا اطلاق نہیں ہو گا۔ البتہ جمہور صحابہ اور ابن عباس کے مابین یہ اختلاف منقول ہے کہ جمہور ماں کے حصے میں تخفیف کے لیے کم سے کم دو بھائیوں کی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہیں، جب کہ ابن عباس کی رائے یہ تھی کہ جمع کے صیغہ کی ظاہری دلالت کے مطابق ان کی کم سے کم تعداد تین ہونی چاہیے۔ مصنف کی رائے ان دونوں نکتوں کے حوالے سے جمہور سے مختلف ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے یہاں ’اخوۃ‘ کی تعبیر نہ تو صرف بھائیوں کے لیے آئی ہے اور نہ اس سے دو یا تین کی تعداد مراد ہے۔ ’اخوۃ‘ بھائیوں اور بہنوں، دونوں کے لیے عام ہے اور جمع کا صیغہ تعداد پر دلالت کرنے کے لیے نہیں، بلکہ صرف ان کی موجودگی پر دلالت کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کا کوئی ایک بہن یا بھائی بھی موجود ہو تو قرآن کا یہ حکم اس صورت کو شامل ہے۔

دوسرا یہ کہ جمہور فقہاء کے نزدیک یہاں میت کے بھائیوں کی موجودگی صرف اس پہلو سے اثر انداز ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی سے کم ہو کر چھٹا حصہ رہ جاتا ہے، لیکن بھائی ترکے میں حصہ دار نہیں بنتے۔ یہ بات بظاہر غیر معقول دکھائی دیتی ہے، کیونکہ کسی ایک رشتہ دار کی موجودگی کی وجہ سے دوسرے کے حصے میں کمی تبھی معقول ہو سکتی ہے جب اس رشتہ دار کو ترکے میں حصہ دینا پیش نظر ہو۔ مثلاً اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اولاد کی موجودگی میں ماں باپ دونوں کا حصہ ایک ایک سدس بتایا ہے۔ یہاں چونکہ اولاد ایک

حصہ دار فریق کے طور پر موجود ہے اور اسے ترکہ دلوانا مقصود ہے، اس لیے ان کی وجہ سے ماں باپ کے حصے کم رکھا جانا پوری طرح سمجھ میں آتا ہے۔ تاہم بھائیوں کے معاملے میں جمہور کی تفسیر کے مطابق صورت یہ ہے کہ ان کو ترکے میں سے کوئی حصہ تو نہیں ملے گا، لیکن وہ ماں کے حصے کو ایک تہائی سے کم کر کے ایک سدس تک لے آئیں گے، جب کہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے باقی سارے مال کا حق دار مرنے والے کا باپ قرار پائے گا۔ گویا ایک ایسا فریق جس کا ترکے میں کوئی حصہ نہیں، محض اپنی غیر متعلق موجودگی کے باعث وارثوں کے حصے کے تناسب میں فرق کا موجب بن جاتا ہے جو بظاہر غیر معقول ہے۔

فقہاء نے دو تابعین کے اہل علم سے اس کی توجیہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ مرنے والے کے بہن بھائی ہوں تو ان کی کفالت باپ کے ذمے ہے، اس لیے اس صورت میں ماں کا حصہ کم کر کے باپ کو زیادہ دلوا دیا گیا ہے تاکہ بہن بھائیوں کی کفالت میں اس کو معاونت مل جائے (تفسیر ابن ابی حاتم ۳/۸۸۳)۔ تاہم میت کے بہن بھائی اگر بعض صورتوں میں نابالغ اور باپ کے دست نگر ہو سکتے ہیں تو بعض صورتوں میں بالغ اور خود کفیل بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں مذکورہ توجیہ بظاہر مکمل دکھائی نہیں دیتی، البتہ اس کی روشنی میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر مرنے والے کے بہن بھائی محتاج کفالت ہوں تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری ان کے باپ پر ہوگی، جب کہ دوسری صورت میں، جب وہ بالغ اور خود کفیل ہوں تو شرعی اخلاقیات کی رو سے وہ ماں باپ، خاص طور پر ماں کے اخراجات کی کفالت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ چونکہ اس صورت میں ماں کا انحصار اپنے نفقے کے لیے صرف شوہر پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کے بیٹے، یعنی مرنے والے کے بھائی بھی اس ذمہ داری میں شریک ہوں گے، اس لیے قرآن نے اس صورت میں ماں کے حصے میں کمی کر کے باپ کے حصے میں اضافہ کر دیا ہے۔

جمہور فقہاء کی رائے کے برخلاف، عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ وہ اس صورت میں ماں کے حصے میں کمی کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ ماں سے جو چھٹا حصہ واپس لیا گیا ہے، وہ بہن بھائیوں میں تقسیم کر دیا جائے (احکام القرآن ۸۱/۲)۔ گویا ابن عباس کے نزدیک والدین کی موجودگی میں بہن بھائی چھٹے حصے کے حق دار ہیں، جب کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ اولاد کے قائم مقام ہو کر پورے ترکے کے حق دار بن جاتے ہیں۔ ابن عباس کی یہ رائے اس نکتے پر مبنی ہے کہ عقلاً بھائیوں کی موجودگی میں ماں کا حصہ کم کرنا تبھی قابل فہم ہو سکتا ہے جب ترکے میں سے بھائیوں کو کچھ دینا مقصود ہو۔ اگر بھائی حصہ دار نہیں تو محض ان کی موجودگی کی وجہ سے ماں اور باپ کے حصوں کے تناسب میں تبدیلی کرنا ایک غیر معقول بات بن جاتی ہے۔ صاحب ”تفسیر المنار“ نے بھی اس نکتے

کے حوالے سے ابن عباس کے موقف کو جمہور کے مقابلے میں زیادہ معقول قرار دیا ہے (۴۱۸-۴۱۷/۳)۔
جصاص نے جمہور کی رائے کے حق میں یہ استنباط پیش کیا ہے کہ چونکہ 'فَانْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ، وَوَرِثَةُ أَبَوَاهُ' پر متفرع ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صرف ماں باپ وارث ہوں اور ان کے ساتھ بھائی موجود ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی سے چھٹے حصے میں تبدیل ہو جائے گا (احکام القرآن ۸۲/۲)۔ لیکن یہ تفسیر عربیت کی رو سے وزنی معلوم نہیں ہوتی اور اسلوب کلام سے بظاہر ابن عباس کی بات کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ 'فَانْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلَأُمُّهُ الثَّلَاثُ' میں حرف 'فا' سے 'وَرِثَةُ أَبَوَاهُ' پر تفریع کی گئی ہے، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملے گا، لیکن اگر ماں باپ کے ساتھ بھائی بھی ہوں، یعنی وہ بھی وراثت میں شریک ہوں تو پھر ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

مصنف کا نقطہ نظر بھی یہاں اس حوالے سے ابن عباس کی رائے کے مطابق ہے کہ بھائیوں کی موجودگی میں ماں کا حصہ کم کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس صورت میں بھائی بھی ترکے میں حصہ دار بنیں گے، تاہم مصنف کو ابن عباس کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ بھائی، ماں کے چھوڑے ہوئے چھٹے حصے کے وارث بنیں گے۔ مصنف کے نزدیک اس صورت میں بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہو کر ماں اور باپ کے حصوں کی ادائیگی کے بعد باقی ترکے کے حق دار بن جاتے ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اس کی طرف صرف اشارہ کرنے اور بہن بھائیوں کی اصولی حیثیت کی طرف متوجہ کرنے پر اکتفا کیا ہے، جب کہ سورہ کی آخری آیت میں، اس نوعیت کی ایک صورت حال پیش آنے پر بہن بھائیوں کی وراثت سے متعلق اسی حکم کو بالکل واضح اور متعین انداز میں بیان فرما دیا ہے۔

مصنف کی اس رائے پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر بہن بھائیوں کی موجودگی میں ماں اور باپ، دونوں کا حصہ کم ہو کر ایک سدس تک محدود ہو جاتا ہے تو زیر بحث آیات میں حصے میں تخفیف کا ذکر 'فَانْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلَأُمُّهُ السُّدُسُ' کے الفاظ میں صرف ماں کے حوالے سے کیوں کیا گیا ہے، جب کہ اصولاً یہاں 'فلکل واحد منہما السدس' کے الفاظ ہونے چاہئیں تھے۔ مصنف نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں دراصل سابقہ جملے (وَوَرِثَةُ أَبَوَاهُ فَلَأُمُّهُ الثَّلَاثُ) کی رعایت سے، مجانست کے اسلوب میں، وہی تعبیر اختیار کرتے ہوئے ماں کا حصہ بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے، تاہم مراد یہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ بہن بھائی بھی موجود ہوں تو جیسے ماں کا حصہ واپس سدس پر چلا جائے گا، اسی طرح باپ کا بھی وہی حصہ لوٹ آئے گا۔

کلالہ کی وراثت

”...آیت میں ’یُورَثُ‘ ہمارے نزدیک، باب افعال سے مبنی للمفعول ہے۔ ’کَلَلَتْ‘ اُس سے مفعول لہ ہے۔ ’كَانَ‘ یہاں ناقصہ ہے، ’رَجُلٌ أَوْ امْرَأَةٌ‘، ’كَانَ‘ کے لیے اسم ہیں اور ’یُورَثُ‘ اُس کی خبر واقع ہوا ہے۔ اس تالیف کی رو سے اس کا ترجمہ یہ ہو گا: ”اور اگر کسی مرد یا عورت کو اُس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے۔“ ... مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن، ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اُس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتہ کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر، اپنے چچا زید کو باقی ترکے کا وارث بنادیتا ہے اور اُس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے، اُس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔“

(میزان ۵۳۰)

سورۃ نساء کی آیت ۱۲ میں ’وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَلَةً أَوْ امْرَأَةً وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ‘ کی تفسیر میں جمہور فقہاء و مفسرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں مرنے والے کے والدین اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں اس کے بہن بھائیوں کا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”اگر وہ شخص جس کی وراثت تقسیم کی جا رہی ہے، کلالہ ہو، (یعنی اس کے والدین اور اولاد میں سے کوئی موجود نہ ہو) اور اس کا ایک بھائی یا بہن ہو۔“ تاہم یہاں بہن بھائیوں کا حصہ ایک سدس یا ثلث بتایا گیا ہے، جب کہ آخری آیت میں بہن بھائیوں کو مختلف صورتوں میں بعینہ اتنے حصوں کا حق دار قرار دیا گیا ہے جو آیت ۱۱ میں اولاد کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ یوں یہ ایک ہی رشتہ سے وارث بننے والوں کے متعلق دو متضاد حکم بن جاتے ہیں۔ جمہور کے نزدیک ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آیت ۱۲ کو ماں شریک بہن بھائیوں سے، جب کہ آخری آیت کو سگے اور باپ شریک بہن بھائیوں سے متعلق قرار دیا جائے اور اس کی تائید سعد بن ابی وقاص سے منسوب ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں آیت ۱۲ میں ’وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ‘ کے ساتھ ’مِنْ أُمِّ‘ کے الفاظ کا اضافہ بھی موجود ہے۔

مولانا فراہی نے اس رائے پر یہ تنقید کی ہے کہ قرآن کے الفاظ اور سیاق و سباق میں آیت کو ماں شریک

بہن بھائیوں کے ساتھ مخصوص قرار دینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر وہ بات کہنا پیش نظر ہوتی جو جمہور کی تفسیر میں سمجھی گئی ہے تو بہن بھائی کے ذکر میں ماں شریک کی قید متواتر قراءت کا حصہ ہونی چاہیے تھی۔ سعد بن ابی وقاص کی شاذ قراءت کی حیثیت ایک خارجی دلیل کی ہے، جب کہ قرآن کے باہر کی کسی دلیل سے ایسی تخصیص پیدا کرنا جس کا قرینہ قرآن میں موجود نہ ہو، مولانا کے نزدیک درست نہیں۔ چنانچہ مولانا نے مذکورہ آیات کی ایک مختلف تاویل بیان کی ہے جو جمہور کی رائے سے مختلف ہے۔ مولانا کا نقطہ نظریہ ہے کہ ان دونوں آیات میں کسی فرق کے بغیر مرنے والے کے سبھی بہن بھائیوں کا حصہ بیان کیا گیا ہے، البتہ یہاں حکم کے بیان میں تدریج کا اصول ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چونکہ بہن بھائیوں کو ترکے میں حصہ دار تسلیم کرنا لوگوں کے لیے مشکل تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے مرحلے پر بہن بھائیوں کو بالکلیہ اولاد کے قائم قرار دینے کے بجائے انھیں جزوی طور پر، یعنی ایک سدس یا ثلث میں حصہ دار قرار دیا اور پھر تعمیل حکم کے لیے آمادگی پیدا ہو جانے کے بعد سورہ کے آخر میں پورا حکم بیان کر دیا گیا (اصول الشرائع ص ۳۸)۔

مصنف کو مولانا فراہی کے اس اصولی موقف سے توافق ہے کہ قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص کا قرینہ خود کلام میں موجود نہ ہو تو کسی خارجی دلیل سے، چاہے وہ خبر واحد کی صورت میں ہو یا خود قرآن کی کسی معروف یا غیر معروف قراءت کی صورت میں، قرآن کے ظاہر کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، تاہم آیت کی تفسیر میں وہ جمہور مفسرین اور مولانا فراہی، دونوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ آیت ۱۲ میں 'وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُؤْرَثُ كَلَلَةً' کا مصداق مرنے والا نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جس کو وارث بنایا جا رہا ہو اور لفظ 'كَلَلَةً'، 'كَانَ' کی خبر نہیں، بلکہ 'يُؤْرَثُ' کی ضمیر سے مفعول لڑ ہے۔ یعنی آیت میں زیر بحث صورت یہ نہیں کہ مرنے والا کلالہ ہو جس کے ماں باپ یا اولاد موجود نہ ہوں، بلکہ یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں مرنے والے نے کسی دور کے رشتے دار کو وارث قرار دیا ہو۔

اس تفسیر کی رو سے آیت کا مدعا یہ بنتا ہے کہ اگر مرنے والے نے والدین اور اولاد کی غیر موجودگی میں (یا بعض صورتوں میں ورثہ کے حصے ادا کرنے کے بعد بچے ہوئے ترکے میں) اپنے کلالہ رشتہ داروں، مثلاً بھائی بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو اپنا وارث قرار دیا ہو، جب کہ اسی نوعیت کی قرابت رکھنے والے دوسرے افراد کو ورثہ سے محروم رکھا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتہ کے دوسرے متعلقین کو بالکل محروم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جس شخص کو مرنے والے کی طرف سے

ترکے کا وارث بنایا گیا ہے، اس کا کوئی ایک بہن یا بھائی ہو تو اس کو ترکے کا چھٹا حصہ، جب کہ ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں ترکے کا ایک تہائی ان میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ مرنے والے کے متعین کردہ وارث کو دے دیا جائے۔

مصنف نے اس تفسیر کی تائید میں ’يُوصِي بِهَآ اَوْ ذَيْنِ‘ میں صیغہ مجہول سے استدلال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اولاد، والدین اور زوجین کے حصے بیان کرتے ہوئے وصیت کا ذکر صیغہ معروف کے ساتھ کیا گیا ہے، جب کہ زیر بحث حکم کے بیان میں اسلوب کو بدل کر صیغہ مجہول استعمال کیا گیا ہے اور اسلوب کا یہ تغیر اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں حکم کی ابتدا میں ’وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ‘ سے مراد مرنے والا نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو وارث بن رہا ہے (میزان ۵۲۹)۔

مصنف کی تائید میں یہ نکتہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ اس پورے سلسلہ کلام میں ترکے میں ورثہ کے حصے بیان کرتے ہوئے مرنے والے کے بجائے ورثہ کی موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ اولاد کو فلاں اور فلاں صورتوں میں اتنا حصہ ملے گا، والدین کے حصے مختلف صورتوں میں یہ ہوں گے، اور زوجین اگر ایک دوسرے کے وارث بن رہے ہوں تو ان کے حصے یہ اور چیز ہوں گے۔ اس اسلوب کلام کے تسلسل میں ’وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ‘ کو بھی وارث پر محمول کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ گویا نسق کلام یوں ہے کہ اگر مرنے والے کا وارث قریبی رشتہ دار بن رہے ہوں تو ان کے حصے یہ ہوں گے، لیکن اگر قریبی رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں کسی دور کے قرابت دار کو وارث بنایا گیا ہو تو اس کو ترکہ اس ہدایت کے مطابق دیا جائے گا۔

مزید یہ کہ اس حکم میں ماں شریک بہن بھائیوں کو ’لِلَّذَكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ‘ کے بجائے مساوی طور پر حصہ دار قرار دینا وراثت کے عام اصول کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مصنف کی تفسیر کے لحاظ سے یہ بات قابل فہم ہے، کیونکہ جس بہن یا بھائی کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ اصلاً وارث نہیں، بلکہ اسے وارث بنائے جانے والے شخص کے ساتھ قرابت کی وجہ سے، محض دل جوئی کے پہلو سے، ترکے میں حصہ دار قرار دیا جا رہا ہے اور اس صورت میں بہنوں اور بھائیوں کے حصوں میں امتیاز نہ کرنے کی حکمت سمجھ میں آتی ہے۔

جمہور کی تفسیر میں ایک فقہی الجھن یہ بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی رو سے مرنے والے کے ماں شریک بہن بھائی تو ذوی الفروض میں شامل ہو جاتے ہیں جن کو اولاد کی موجودگی میں بھی ترکے میں سے حصہ دینا لازم ہے، جب کہ اس کے مقابلے میں سگے بہن بھائی اولاد کی موجودگی میں محروم قرار پاتے ہیں، حالانکہ ان کا رشتہ

ماں شریک بہن بھائیوں سے زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ اسی الجھن کے پیش نظر فقہائے صحابہ کے ایک گروہ نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ سگے بہن بھائیوں کی ماں تو بہر حال ایک ہی ہوتی ہے، اس لیے اس تعلق سے انھیں بھی ماں شریک بہن بھائیوں کے حصے میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ سیدنا عمر، سیدنا عثمان، عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ایسی صورت حال میں ماں شریک بہن بھائیوں کے حصے میں سگے بہن بھائیوں کو بھی حصہ دار قرار دیتے تھے۔ ان حضرات سے اس کا استدلال یہ نقل ہوا ہے کہ جب دونوں کی ماں ایک ہے تو باپ کے ایک ہونے سے یہ رشتہ کم زور نہیں ہوتا، بلکہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے (سنن الدارمی، رقم ۲۹۲۴، ۲۹۲۶)۔ زید بن ثابت سے یہ بات اس اسلوب میں منقول ہے کہ یہی مان لو کہ ان کا باپ کوئی گدھا تھا، لیکن اس نے ان کی قرابت کو بڑھایا ہی ہے، کم تو نہیں کیا (المستدرک علی الصحیحین، رقم ۸۰۵۰)۔

سیدنا عمر کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس استدلال کی روشنی میں انھوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔ چنانچہ ایک واقعے میں انھوں نے سگے بہن بھائیوں کو ماں شریک بہن بھائیوں کے حصے میں شریک قرار دیا تو انھیں ان کے ایک سابقہ فیصلے کا حوالہ دیا گیا جس میں انھوں نے سگے بہن بھائیوں کو حصہ نہیں دلویا تھا۔ سیدنا عمر نے جواب میں کہا کہ وہ فیصلہ ہم نے اس مقدمے میں کیا تھا اور یہ فیصلہ ہم اس مقدمے میں کر رہے ہیں (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۱۷۴)۔

یہ موقف مذکورہ عقلی اشکال کا تورفع کر دیتا ہے، لیکن متعلقہ آیات کی ظاہری دلالت کے حوالے سے اس سوال کا جواب نہیں دیتا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہی تقسیم تھی تو ماں شریک بہن بھائیوں اور سگے بہن بھائیوں کے حصے اس طرح الگ الگ آیات میں بیان کرنے کا اسلوب کیوں اختیار کیا گیا جو اپنے ظاہر کے لحاظ سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ماں شریک بہن بھائی تو اولاد کی موجودگی میں بھی، میاں بیوی اور والدین کی طرح، وارث بنیں گے، جب کہ سگے بہن بھائیوں کے وارث بننے کے لیے یہ شرط ہے کہ مرنے والے کی اولاد موجود نہ ہو؟ یوں ایک موقف اگر عقلی اشکال کا حل پیش کرتا ہے تو نصوص کی ظاہری دلالت مجروح ہوتی ہے، جب کہ دوسرا موقف

۱۔ بعض فقہی کتابوں میں منقول روایت میں یہ جملہ کہ ھب إن أبانا کان حملاً، ألسنا من أم واحدة؟ (مان لیجیہ کہ ہمارا باپ ایک گدھا تھا، لیکن کیا ہماری ماں ایک نہیں ہے؟) ان بہن بھائیوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے جنھیں سیدنا عمر نے حصہ نہیں دلویا تھا اور پھر ان کے استدلال پر اس فیصلے سے رجوع کر لیا (سرخسی، المبسوط ۲۹/۱۵۴)۔ تاہم محدثین کی نقل کردہ روایات و آثار میں ہمیں اس کا کوئی ماخذ نہیں مل سکا۔

ظاہری دلالت کو برقرار رکھتا ہے تو ایک بہت مضبوط عقلی و فقہی اعتراض کا کوئی حل پیش نہیں کر پاتا۔

مسلمان اور غیر مسلم کے مابین توارث

”والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو حکم کی یہ علت تقاضا کرتی ہے کہ اُسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔ یہ استثنا، اگر غور کیجیے تو کہیں باہر سے آکر اس حکم میں داخل نہیں ہوا، اس کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے، لہذا قرآن کا کوئی عالم اگر اسے بیان کرتا ہے تو یہ ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے، بلکہ ٹھیک اُس مدعا کی تعبیر ہے جو قرآن کے الفاظ میں مضمر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا: ... ”نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔“ ... اتمام حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آگئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قربت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانی چاہیے۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ (میزان ۴۰)

اس اقتباس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد (لا یرث المؤمن الکافر ولا الکافر المؤمن) کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ آپ نے ارشاد فتح مکہ کے موقع پر اصلاً ان جاہل ادوں سے متعلق فرمایا تھا جو بعض مہاجرین کے مشرک اقربا بنے ان کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کی غیر موجودگی میں تقسیم کر لی تھیں (بخاری، رقم ۴۲۸۲، ۴۲۸۳)۔ چونکہ قرآن مجید میں احکام میراث بیان کرتے ہوئے ایسی کوئی تخصیص بیان نہیں کی گئی، اس لیے اس ضمن میں ایک اہم سوال تو یہ سامنے آتا ہے کہ اس تخصیص کی نوعیت کیا ہے؟ اصول فقہ کی روایت میں اس حدیث کو اس اصول کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ خبر واحد کے ذریعے سے قرآن کے عام حکم کی تخصیص کی جاسکتی ہے۔ امام شافعی کے نقطہ نظر سے اس تخصیص کی نوعیت، قرآن کی مراد کی تبیین کی ہوتی ہے اور چاہے بظاہر قرآن میں اس تخصیص کی کوئی بنیاد موجود نہ ہو، اسے توضیح و تبیین ہی تصور کرنا ضروری ہے، یعنی اسے نسخ اور تغیر نہیں کہا جاسکتا۔ احناف، اس کے برخلاف، ایسی تخصیصات کو تغیر قرار دیتے اور نسخ کی ایک جزوی صورت تصور کرتے ہیں۔

مصنف اصول کی حد تک امام شافعی کے موقف سے اتفاق رکھتے ہیں، تاہم ان کی رائے میں عملاً ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جو قرآن کے حکم میں تخصیص یا زیادت کرتی ہو اور اس کی بنیاد قرآن میں نہ بتائی جاسکے۔ اس نقطہ نظر کے تحت مصنف نے مسلمان اور غیر مسلم کے مابین توارث کی ممانعت کی بنیاد بھی خود قرآن میں واضح کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مرنے والے کی میراث میں رشتہ داروں کو حصہ دار قرار دینا منفعت کے اصول پر مبنی ہے اور مختلف حصہ داروں کے حصوں میں باہمی فرق کا اصول بھی منفعت کا کم یا زیادہ ہونا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر کسی خاص صورت میں رشتہ داروں کے مابین منفعت ختم ہو جائے تو اس پر مبنی وراثت کے حکم کو بھی منتفی ہو جانا چاہیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیر بحث صورت میں اسی اصول کا اطلاق کیا ہے۔

مصنف کی رائے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اس ممانعت کو اتمام حجت کے قانون کی روشنی میں جزیرہ نماے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے متعلق قرار دیتے ہیں، یعنی اسے شریعت کا کوئی ابدی اور دائمی حکم تصور نہیں کرتے۔ زیر بحث حکم کے دائرہ اطلاق کی تعیین کے حوالے سے اہم اختلافات تو فقہائے صحابہ کے مابین ہی سامنے آگئے تھے۔ جمہور صحابہ اس کا اطلاق تمام غیر مسلموں پر کرنے کے قائل تھے، جب کہ معاذ بن جبل اور سیدنا معاویہ کا زاویہ نظریہ تھا کہ اہل کتاب پر اس کا اطلاق بعینہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس صورت میں وہی اصول لاگو ہو گا جو اہل کتاب کے ساتھ نکاح کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے، یعنی جس طرح مسلمان مرد اہل کتاب کی خواتین سے نکاح کر سکتے ہیں، لیکن مسلمان خواتین، اہل کتاب کے مردوں سے نکاح نہیں کر سکتیں، اسی طرح مسلمان اپنے اہل کتاب اقربا کا وارث بھی بنے گا، لیکن اہل کتاب کو ’الاسلام یزید ولا ینقص‘ کے اصول کے تحت ان کے مسلمان رشتہ داروں کی وراثت میں شریک نہیں کیا جائے گا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۱۰۱، ۳۲۱۰۲۔ جصاص، احکام القرآن ۱۰۲/۲)۔ یہی رائے عبد اللہ بن معقل، مسروق، سعید بن المسیب، محمد بن الحنفیہ، علی بن الحسین اور ابراہیم نخعی وغیرہ سے بھی منقول ہے (الام ۱۵۲/۵۔ المغنی ۶/۶۲۲۔ الموسوعۃ الفقہیہ ۵۲/۳)۔

امام شافعی نے اس موقف کی توجہ یوں کی ہے کہ شان و رود کے لحاظ سے زیر بحث حکم میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اسے صرف مشرکین عرب کے لیے خاص سمجھا جائے، جب کہ اہل کتاب کو اس کے دائرے میں شامل نہ مانا جائے (الام ۱۵۲/۵)۔ گو یا سیدنا معاویہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظریہ تھا کہ حدیث میں مسلمان کے کافر کا وارث بننے کی جو ممانعت آئی ہے، وہ صرف مشرکین سے متعلق ہے، جب کہ اہل کتاب کی

وراثت ایک قیاسی استدلال کی بنیاد پر مسلمان کو مل سکتی ہے۔

اسی نوعیت کا اختلاف اس ممانعت کا اطلاق مرتد پر کرنے کے حوالے سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سیدنا علی، عبد اللہ بن مسعود، عمر بن عبد العزیز، حسن بصری، سعید بن المسیب اور شعبی سے منقول ہے کہ وہ اسلام سے مرتد ہو جانے والے شخص کی میراث اس کے مسلمان وارثوں کو دلوایا کرتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۰۳۳-۳۲۰۳۳)۔ فقہائے احناف بھی یہ قرار دیتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو جائے اور اسی حالت میں مر جائے تو اس کی وراثت اس کے مسلمان حصہ داروں میں تقسیم کی جائے گی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ مذکورہ ارشاد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر دراصل ایسے اہل کفر کا حکم بیان کرنا ہے جنہیں اپنے کفر پر قائم رہنے کا حق ہو، اس لیے کہ شریعت کے عرف میں 'کافر' کے لفظ کا عمومی اور متبادر اطلاق ایسے ہی اہل کفر پر کیا جاتا ہے۔ مرتد بھی اگرچہ کفار کے زمرے میں شمار ہوتا ہے، لیکن اس کی نوعیت دوسرے اہل کفر سے مختلف ہے اور اسی وجہ سے بہت سے شرعی و فقہی احکام میں بھی مرتد اور دوسرے اہل کفر میں امتیاز کیا گیا ہے۔ مثلاً مرتد اگر اسلامی ریاست میں ہو تو اسے اپنے ارتداد پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح اس کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں اور اگر مرتد عورت ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنا کسی مسلمان کے لیے روا نہیں۔ اس تناظر میں مرتد 'لا یرث المسلم من الکافر' کے ارشاد نبوی کے دائرۃ اطلاق میں بھی شامل نہیں اور اس صورت کا حکم قیاس و اجتہاد سے متعین کیا جائے گا (طحاوی، شرح معانی الآثار ۳/۲۲۶-جصاص، شرح مختصر الطحاوی ۶/۱۱۵)۔

بعد کی فقہی روایت میں امام ابن القیم نے زیر بحث حکم کی تعلیل اور دائرۃ اطلاق کی تحدید میں ایک اور اہم زاویہ نظر پیش کرتے ہوئے جمہور اہل علم کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ توارث کی ممانعت کا مقصد مسلمان اور کافر کے مابین موالاة، یعنی معاشرتی تعلق کو محدود کرنا ہے (سرخسی، المبسوط ۳۰/۳۰)۔ شاہ ولی اللہ اس کی حکمت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معاشرتی معاملات میں مسلمان اور کافر کے مابین اختلاط چونکہ دین میں بعض خرابیوں کا موجب ہو سکتا ہے، اس لیے شریعت نے بعض حوالوں سے اس کو ممنوع اور بعض حوالوں سے محدود کر دیا ہے (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۲۳)۔ ابن القیم اس تعلیل کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں شریعت کا منشا یہ نہیں کہ معاشرت کی سطح پر مسلمان اور غیر مسلم کے مابین قرابت داری اور خاندانی تعلق سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں، ان کی نفی کی جائے۔ ابن القیم مختلف شرعی احکام سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ شریعت میں قرابت داری

کے حقوق کی نفی نہیں کی گئی اور اس پہلو سے توارث کی ممانعت کا حکم بھی موالاة کی نفی پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کسی کے آزاد کردہ غیر مسلم غلام کا چھوڑا ہوا مال 'ولاء' کے طور پر اس کے آزاد کنندہ کو مل رہا ہو تو اہل علم کا ایک گروہ، جس میں سیدنا علی، عمر اور جابر بن عبد اللہ بھی شامل ہیں، اس صورت میں اختلاف مذہب کو توارث میں مانع قرار نہیں دیتا (احکام اہل الذمۃ ۸۶۶-۸۶۷)۔ (اسی طرح غیر مسلم اقربا کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کی مالی معاونت شریعت میں ممنوع نہیں، جب کہ اہل علم کے ایک گروہ کے نزدیک، جس کا ذکر سابقہ سطور میں امام ابن جریر طبری کے حوالے سے کیا جا چکا ہے، اگر کسی کا قریبی رشتہ دار غیر مسلم ہونے کی وجہ سے وارث نہ بن سکتا ہو تو وصیت کے اختیار کے تحت اسے وارث میں حصہ دینا واجب ہے)۔

ابن القیم کے نزدیک اس ممانعت کی اصل بنیاد محاربہ ہے اور وہ 'لا یرث المسلم من الکافر' کو حربی کافر سے متعلق قرار دیتے ہیں جس کا محارب ہونا، مسلمان کو اس کا وارث بنانے سے مانع ہے۔ چونکہ اہل ذمہ میں یہ مانع نہیں پایا جاتا، اس لیے ان کی وراثت مسلمان رشتہ داروں کو دلوانا اس حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ ابن القیم مسئلے کے دوسرے پہلو کے حوالے سے جمہور کے اسی موقف سے اتفاق کرتے ہیں کہ ذمی، مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔ تاہم وہ اس کا ماخذ حدیث کے دوسرے جملے یعنی 'لا یرث الکافر من المسلم' کو قرار نہیں دیتے، کیونکہ اس حدیث میں ان کے نقطہ نظر سے حربی کفار کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ ابن القیم کے نزدیک ذمی کے، مسلمان کا وارث بننے کی ممانعت دراصل تناصر کے سیاسی اصول سے اخذ ہوتی ہے، یعنی وہ اسے دارالاسلام میں اہل ذمہ کی سیاسی حیثیت اور سیاسی ذمہ داریوں کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ مسلمان معاشرہ ہر طرح سے اہل ذمہ کی دیکھ بھال اور ان کے مذہبی و سماجی حقوق کے تحفظ کا ذمہ دار ہے، اس لیے اس کے عوض میں اہل ذمہ کی وراثت ان کے مسلمان رشتہ داروں کو ملنی چاہیے۔ اس کے برعکس، اہل ذمہ دارالاسلام کی اجتماعی ذمہ داریوں میں شریک نہیں ہوتے، اس لیے انھیں ان کے مسلمان اقربا کی وراثت نہ دیا جانا قرین انصاف ہے (احکام اہل الذمۃ ۸۷۲)۔

دور جدید میں بہت سے اہل علم نے امام ابن القیم کے اس نقطہ نظر کا حوالہ دیتے ہوئے غیر مسلم ممالک میں

۲۔ ابن القیم نے یہ نقطہ نظر اپنے استاذ امام ابن تیمیہ کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے۔ تاہم ابن تیمیہ کے فتاویٰ سے ان کا موقف جمہور کی رائے کے مطابق سامنے آتا ہے (مجموع الفتاویٰ ۱۵/۴۴۳)۔ بہر حال اس حوالے سے ابن تیمیہ کی رائے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو ابن القیم کے بیان کو اس کی زبانی روایت کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔

مقیم نو مسلموں کے لیے اپنے غیر مسلم قرابت داروں سے وراثت پانے کے جواز کو دینی مصلحت کا تقاضا قرار دیا ہے (یوسف القرضاوی، فی فقہ الاقلیات المسلمۃ: ۱۲۸)۔ تاہم ابن القیم کا طرز استدلال موجودہ صورت حال میں اپنی بنیاد کے لحاظ سے یک طرفہ توارث تک محدود نہیں رہتا، بلکہ دو طرفہ توارث کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اگر عدم توارث کی بنیاد موالاة کی نفی نہیں، بلکہ تناصر کا سیاسی اصول ہے تو جدید جمہوری ریاستوں میں، چاہے وہ مسلمانوں کی ہوں یا غیر مسلموں کی، تمام شہریوں کو مساوی سیاسی و سماجی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور وہ اصولی طور پر یکساں حیثیت میں معاشرے اور ریاست کے مفاد میں ذمہ داریاں انجام دینے کے اہل سمجھے جاتے ہیں۔ یوں تناصر کے اصول کی عملی نوعیت بالکل مختلف ہو جانے کی وجہ سے یہ کہنا ممکن نہیں کہ ایک مذہب کے پیروکار تو تناصر کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور دوسرے مذہب کے پیروکار نہیں کر رہے۔ دوسرے لفظوں میں، ابن القیم کی تعلیل کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کلاسیکی اسلامی ریاست میں تناصر کا جو اصول توارث میں مانع تھا، جدید جمہوری ریاستوں میں کالعدم ہو جانے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم کے مابین دو طرفہ توارث بھی درست قرار پائے، کیونکہ اس کی بنیاد موالاة پر ہے، جس کی نفی، ابن القیم کی رائے کے مطابق، شریعت نے نہیں کی۔

مصنف کی رائے اس بحث میں بنیادی طور پر ابن القیم کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہے، یعنی وہ اس ممانعت کو قرابت داری کے حقوق اور موالاة کی اصولی نفی پر مبنی نہیں سمجھتے، بلکہ ایک اضافی مانع کا مقتضا قرار دیتے ہیں۔ البتہ مصنف کے نزدیک یہ مانع تناصر کا سیاسی اصول نہیں، بلکہ اتمام حجت کا دینی اصول ہے۔ اس تناظر میں مصنف، جمہور کے اس موقف سے اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ ممانعت مشرکین اور اہل کتاب، دونوں سے متعلق تھی، لیکن وہ اس کو مشرکین اور اہل کتاب میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطبین تک محدود سمجھتے ہیں جن پر اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ اہل ایمان کے ساتھ ان کی قرابت اللہ کی نظر میں گویا کالعدم ہے اور اس تعلق کی بنا پر رشتہ داروں کا ایک دوسرے کے مال پر جو حق عائد ہوتا ہے، وہ بھی اس صورت میں اپنی بنیاد سے محروم ہو جاتا ہے۔

